Urdu Literary Book Serial
NIQAAT-12
Faisalabad, Pakistan
June, 2014

ادارت:
قاسم یعقوب

سرورق خیال: عمار انجم (0323-7655023)
ٹائٹل ورک: منیب جونیئر (0301-2434281)
مطبع: پی بی ایچ پرنٹرز، لاہور
قیمت: 300/ روپے

'نقاط' میں شامل مضامین ادارے کی نظریاتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں، تاہم کسی خاص بحث کے تناظر میں ادارے کی رائے اور مصنف کی رائے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔

'نقاط' کی اشاعت کسی کاروباری نقطہ نظر کے تابع نہیں۔ نقاط سے وابستہ تمام افراد کی خدمات اعزازی ہیں۔

رابطہ
P-240، رحمٰن سٹریٹ، سعید کالونی، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد
ہاؤس 58، سٹریٹ 115، G-13/1، اسلام آباد
(niqaat@gmail.com)

خوف کی دو ہزار پتا نہیں کتنے کلو میٹر لمبی سڑک
(پاکستان میں پوسٹ نائن الیون نظم کا پسِ منظر اور مطالعہ)

سید کاشف رضا

(۱)

پتا نہیں کب ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے یہ طے کر لیا کہ سماج سے سروکار تو ترقی پسند تحریک کے دنوں میں ہوا کرتا تھا؛ اب جب کہ کمیونزم کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک بھی قصہ پارینہ بن چکی، تو انھیں چاہیے کہ اپنی ذاتی محرومیوں ہی کے طوطا مینا بنانے پر اکتفا کرتے رہا کریں۔ کسی نے یہ نہ بتایا کہ سماج سے سروکار رکھنے کے لیے ادیب کا ترقی پسند ہونا ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ لائن کے دائیں ہیں یا بائیں؛ ادیب اگر اپنے سماج سے اُگا ہے تو اُسے اپنے سماج کا ہی نمایندہ ہونا چاہیے۔ کسی ادیب کی کام یابی کے بہت سے پیمانوں میں سے ایک پیمانہ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اس کے متون اس کے سماج اور معاشرے سے کتنا اثر قبول کر سکے اور بدلے میں اپنے سماج اور اپنے معاشرے میں کتنا نفوذ کر سکے۔ اِس پیمانے پر اُس حبیب جالب کی شاعری کو دیکھیے جن کے ہم عصر جدیدیت پسند ان کی شاعری میں سے شعری عیوب تلاش کیا کرتے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ حبیب جالب چونکہ اپنے دور میں اپنے سماج اور اس سماج کے ساتھ پیش آنے والے ہر اہم قصے اور قضیے سے متعلق رہے اس لیے ان کی شاعری آج بھی معنی رکھتی ہے۔ اورنگ زیب اور فرخ سیئر کے زمانے کے شاعر جعفر زٹلی اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں کوئی بہت بڑے شاعر نہیں تھے اور ان کے دور میں ان کی شعری لیاقت کا سکہ بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا، لیکن فرخ سیئر کے زمانے میں جاری ہونے والے ایک سکے کی پیروڈی نے انھیں زندۂ جاوید کر دیا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہے تسمہ کش فرخ سیئر

اور تو اور مغرب کے جدیدیت پسند ادیبوں، شاعروں کو ہی دیکھ لیا جائے تو ان میں سے کوئی بڑا ادیب اپنے سماج اور اپنے دور کے سیاسی حالات سے کٹا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اسی لیے ان ادیبوں کی

تحریروں کا مطالعہ جب ان کے ذاتی پس منظر کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی پس منظر میں کیا جاتا ہے تو ان کی مشکل اور دقیق تحریریں بھی سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔

کسی خاص عہد سے گزرتے ہوئے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ ہم اسے کسی خاص اہمیت سے متصف نہ کر پائیں۔ لیکن ماضی میں جھانکتے ہوئے تاریخ دان کسی گزرے ہوئے عہد کو بہ آسانی کوئی نام دے سکتے ہیں۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ ہمارے بعد کی دنیا گیارہ ستمبر دو ہزار ایک عیسوی کے بعد کے زمانے کو ایک الگ دور قرار دے گی۔ نئی صدی کا آغاز ہوتے ہی سب سے بڑی افتاد ہمارے ملک پاکستان پر پڑی ہے اور تیسری عالمی جنگ ہماری سرزمین اور اس کے قرب و جوار میں لڑی جارہی ہے۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں اس نئے دور اور اس سے منسلکہ واقعات کی realisation ویسی نہیں جیسی ہونی چاہیے تھی۔ لکھنے کو تو بہت سے ادیبوں نے اس افتاد کو لکھا بھی لیکن اس کی مقدار اور معیار ایسا نہیں تھا جو ملک میں جاری ادبی ڈسکورس کا رخ موڑ دیتا۔ ایسی افتاد جب مشرقی یورپ اور یہودیوں پر پڑی تھی تو دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان کے ادب کا پورا نقشہ تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ آج ہولوکاسٹ کا ادب اپنی ایک الگ اور قائم بالذات حیثیت رکھتا ہے جبکہ مشرقی یورپ کی مزاحمتی شاعری کے طفیل ہمیں پولینڈ اور کچھ دیگر ملکوں کی شاعری مغربی یورپ کی عصری شاعری سے آگے بھی نظر آتی ہے اور ہمارے لیے زیادہ پر معنی اور متعلق (relevant) بھی۔ بہ ظاہر تو یہ لگتا ہے کہ ادیب اپنے معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے مشرقی یورپی اور یہودی متون ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ متون یورپ سمیت پورے مغرب میں ایک ایسا ڈسکورس پیدا کرنے میں کامیاب رہے جس کے نتیجے میں سامیت دشمنی (anti samitism) ایک قابلِ نفرین جذبہ قرار پا گئی۔ کیا ہمارے ادب میں یہ قوت ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ادب اپنے سماج، اور اب تو عالمی سماج، سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ادیب اگر ادب سے سنجیدگی سے وابستہ ہو تو اسے کچھ نہ کچھ علم بین الاقوامی سیاسیات اور سیاسی تھیوری کا بھی حاصل کر لینا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہمارے ادیب سیاسی فکر پر موٹی موٹی کتابیں پڑھنے بیٹھ جائیں لیکن جدید فکر سے اتنی آگاہی تو انھیں ضرور ہی ہونی چاہیے جو ادب و شعر میں سیاسی رائے زنی کرتے ہوئے انھیں فاش غلطیوں (pitfalls) سے بچا سکے۔ زیرِ نظر مضمون میں سیاسی فکریات کو صرف اسی حد تک چھیڑا گیا ہے جس حد تک ان کا علم، میرے نزدیک، ایک عام ادیب کے لیے ضروری ہے۔

ہماری ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ادیبوں کے ہاں ایک روحِ عصر (Zeitgeist) کی جستجو بہت اہم خیال کی جاتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس روحِ عصر کی تلاش میں بہت دور جانا نہیں پڑتا تھا اور وہ پڑوس کی دکان سے ہی دست یاب ہو جاتی تھی۔ آج کی سیاست بہت پیچیدہ ہو چکی ہے، اور روحِ عصر کی تلاش میں آپ کو بہت سے ڈپارٹمنٹل سٹور چھاننا پڑ سکتے ہیں جہاں قدم قدم پر نقالوں سے ہوشیار رہنا

پڑ سکتا ہے۔ اپنے دیس اور دنیا کے سماجی و سیاسی معاملات سے سروکار رکھنے کے لیے کسی ادیب کا سوشلسٹ ہونا ضروری بھی نہیں۔ نوم چومسکی جیسے تجربہ کار مفکر نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ سیاسی صداقتوں کو اگر سیدھا سیدھا بیان کر دیا جائے تو ایک عام آدمی بھی حق، سچ اور انصاف کا راستہ آسانی سے تلاش کر لیتا ہے۔ پھر شماریات کا علم بھی تو ہے جس کے ذریعے بہت ساری چیزوں کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر بات تو تب ہے کہ کوئی تلاش اور جستجو بھی کرے۔ ہمارے ہاں تو عالم یہ ہے کہ عام شہری تو رہے ایک طرف، خود ادیبوں، شاعروں میں مطالعے کا رجحان انتہائی کم ہے۔ ایسے میں ان کا 'سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے' والا جہاں ایک کنواں تو ہو سکتا ہے جس میں نرگس کا کوئی پھول اپنا عکس دیکھ کر اتراتا پھرے، مگر کوئی ایسی کائنات نہیں بن سکتا جس کی سیر دنیا کے اور قاریوں کو کرائی جا سکے۔ اقبال نے موت کے مقابلے میں بھی فتح یاب رہنے کے لیے خودی کے 'خودنگر و خودگر و خودگیر' ہونے کا نسخہ بتایا تھا۔ جس ادب کی 'خودنگری' نرگسیت تک محدود ہو جائے، اسے کوئی دوسرا بھلا کیوں دیکھے؟ مطالعے کی کمی ہی کے سبب ہمارے ادیبوں میں خود اپنی سماجی و سیاسی صورتِ حال سے متعلق سوچ بچار کا رجحان بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔ نتیجتاً ہمارے ادیبوں کے ہاں روحِ عصر سے عدم دلچسپی ایک ایسی معصومیت (naivety) پیدا کرتی ہے جو میری نظر میں ادبی معصیت سے کم نہیں۔

آج کی روحِ عصر کیا ہے؟ یہ ایک بڑا سوال ہے جس کے ڈانڈے فلسفے سے جا ملتے ہیں۔ میں اتنی اونچی پرواز کی کوشش نہیں کروں گا اور صرف یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ میرے نزدیک وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو نائن الیون کے بعد کے دور کو اس سے پچھلے دور سے ممتاز کرتی ہیں۔ اور میں کیوں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلیاں ہمارے ادب میں ایک نئی خودنگری، ایک نئے اظہار کی متقاضی ہیں۔ اور پھر یہ بھی کہ پاکستانی ادب میں ان تبدیلیوں کی غمازی کہاں تک ہو سکی ہے۔ اس تبدیلی کے اثرات فکشن اور غزل میں بھی دیکھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن میں اپنی محدودات کے سبب ان کے میدانوں میں خیال کے گھوڑے دوڑانے سے فی الحال قاصر ہوں، اس لیے صرف پاکستانی اردو نظم میں ہی ان کے اثرات کھوجنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے یہ ذکر کہ نائن الیون کے بعد امریکا اور باقی دنیا، خصوصاً یورپ کس انداز میں تبدیل ہوئے۔ نائن الیون ایک سو نوے برسوں میں امریکی سرزمین پر ہونے والا پہلا بڑا حملہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے ہوائی پر حملہ کیا تھا مگر ہوائی کے جزائر امریکا کے مین لینڈ سے دور واقع ہیں۔ امریکا کی سرزمین پر آخری بڑا حملہ ۱۸۱۱ء میں برطانیہ نے کیا تھا جس نے واشنگٹن کی اینٹ سے اینٹ بجا کر وائٹ ہاؤس کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اب ایک سو نوے سال بعد امریکی سرزمین پر حملہ ہوا تو وہ امریکا کے لیے ایسا ہی تھا جیسے کوئی کمی کمین کسی جاگیردار کو اس کی چراگاہ کے اندر جا کر چیلنج کر دے۔ اور امریکی ہئیت مقتدرہ نے اس کا انتقام بھی کسی ہتھ چھٹ جاگیردار ہی کی طرح لیا۔ اس کے بعد جو جنگ

چھڑی اس کا میدان عراق، افغانستان اور پاکستان بنے، جہاں لاکھوں معصوم شہری امریکا اور اس کے حریفوں کی لڑائی میں مارے گئے۔ گیارہ ستمبر کے فوری بعد ہی امریکا میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ اب دنیا پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ امریکا میں انسانی آزادیوں کو محدود کردینے کی مہم چلی اور تہذیبی و سماجی ڈسکورس میں نیوکونز (Neo Cons) نمایاں ہونے لگے جنھوں نے پیشگی حملوں (preemptive strikes) کا فارمولا پیش کیا۔ اس کے بعد سے اب تک پوری دنیا، بالخصوص عراق، افغانستان اور پاکستان، میں لاکھوں معصوم اور بے گناہ افراد امریکی نیوکونز کی وحشت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ امریکی ہیئتِ مقتدرہ کے کارپردازوں کے جرائم اتنے سنگین ہیں کہ انھیں بھی جنگی جرائم کے الزام میں نیورم برگ ٹرائل جیسے عالمی انصاف سے گزارا جاسکتا تھا، لیکن دنیا ابھی ایسے انصاف سے بہت دور ہے۔

اگر نائن الیون کے حملے میں صرف امریکی ہی مارے جاتے تو شاید اس کے اثرات اتنے عالم گیر طور پر محسوس نہ کیے جاتے۔ لیکن اس حملے کی نوعیت تاریخ کے کسی بھی دوسرے حملے سے زیادہ ہمہ گیر تھی۔ حملے میں انیس ہائی جیکروں کے علاوہ 2,977 افراد مارے گئے جن میں امریکا کے علاوہ نوے ملکوں کے تین سو تہتر شہری بھی شامل تھے۔ یہ گلوبل مرگِ انبوہ، جو کئی حلقوں میں جشن کی طرح پیش کی گئی، پاکستان کے بھی آٹھ شہریوں کو نگل گئی۔

یورپ جو ہماری موجودہ تہذیب کا فکری مرکز ہے، اس حملے سے ہزاروں میل دور تھا۔ دنیا کی آخری جنگ عظیم کا مرکزی میدان یورپ ہی تھا جہاں کروڑوں افراد مارے گئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کے علاوہ باقی ریاستوں نے ہوسِ ملک گیری تج کر اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیات کی فراہمی پر توجہ مرکوز کردی تھی۔ ان ملکوں کا تہذیبی ڈسکورس اجتماعی طور پر ویلفیئر اسٹیٹ اور انفرادی طور پر بابر بہ عیش کوش کے فلسفوں کی جانب رجحان رکھتا تھا۔ لیکن نائن الیون کے حملوں کے بعد یورپی عوام کی اکثریت نے بھی یہ خوف محسوس کیا کہ اگر امریکا کے بڑے بڑے شہر دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہ سکے تو اپنے دفاعی اخراجات نہایت ہی کم کردینے والی ان کی حکومتیں خود انھیں ایسی آفات سے کہاں تک محفوظ رکھ سکیں گی۔ یہی خوف تھا جس نے ایک اور ڈسکورس کو دبا دیا جو ممکن بھی تھا اور زیادہ مثبت بھی ثابت ہوتا۔ اور وہ ڈسکورس تھا حملہ آوروں کے غصے کی جڑوں کی تلاش کے مطالبے کا۔ دنیا میں فساد کی سب سے بڑی جڑ مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے مطالبے کا۔ سو یورپ پکے ہوئے پھل کی طرح چھوٹے بش کی جھولی میں آ گرا۔ سوشلزم سے آزاد ہونے والا مشرقی یورپ نئی محبوبہ امریکا سے ملنے کے اشتیاق میں مغربی یورپ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا اور اتحادی افواج میں شمولیت کے لیے ہر طرف سے آمنا وصدقنا ہونے لگی۔ اس کے صلے میں مشرقی یورپ کو چھوٹے بش سے 'نیو یورپ' کا خطاب ملا۔ نائن الیون کے بعد امریکی صدر بش نے ایک سوال اٹھایا تھا: why do they hate us?
لیکن ایسا ہی ایک سوال ہم بھی تو مغرب سے کرسکتے ہیں کہ: why do they hate us?

چلیے امریکا کے کسی تخلیق کار کے بجائے یورپ چلتے ہیں۔ فرانس کے ایک نئے ناول نگار مشیل ویل بیق Michel Houellebecq نے نائن الیون سے کچھ ہی پہلے 'پلیٹ فارم' کے نام سے ایک ناول لکھا تھا۔ اس ناول میں ہمیں نائن الیون سے پہلے ہی ایک بڑے تہذیبی تصادم کی پیش گوئی کی صورت ملتی ہے۔ مشیل ویل بیق کا ہیرو اپنی تہذیب کا کوئی جہادی نہیں؛ وہ تو بس اپنی زندگی سکون سے گزارنا چاہتا ہے، اور اپنی اس خواہش میں وہ پورے یورپ کا مثیل ہے۔ وہ یورپ جو ایک پنشن یافتہ بوڑھے کی طرح اپنی آرم چیئر پر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ ناول میں ہیرو کے باپ کو فرانس میں مقیم ایک عرب لڑکی کے رشتہ دار 'کاروکاری' کے الزام میں قتل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہیرو اپنے باپ کا پیسہ اور ایک محبوبہ لے کر دنیا بھر کی عیش کرتا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ تھائی لینڈ میں ایک مسلمان بم بار کے ہاتھوں اس کی محبوبہ کا خون ہو جاتا ہے۔ یہ ناول ہمارے اس سوال کا جواب ہے جو میں نے اوپر درج کیا۔ اور جواب فلم سنگم کے مشہور تالاب والے گانے میں آنے والے اس ڈائیلاگ سے مشابہ ہے کہ: 'چھوڑو نا، کیوں ستاتے ہو۔''

ایک مرتبہ پھر یاد دلا دوں کہ یہاں میں صرف یورپ کی بات کر رہا ہوں، اس یورپ کی جو باقی دنیا کے کسی جھگڑے جھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا اور اس یورپ میں برطانیہ اور فرانس کی ہیئتِ مقتدرہ شامل نہیں جو امریکی ہیئتِ مقتدرہ اور نیوکونز کے ساتھ شامل باجا کے طور پر کام کرنے پر بہ دستور تیار ہے۔ عراق جنگ کے دوران یورپی بائیں بازو اور لبرل ازم کے لاکھوں حامیوں نے مظاہرے کیے، لیکن شاید ہمارے مذہبی انتہا پسندوں کی یادداشت اتنی اچھی نہیں۔ وہ یورپ کی ساری تہذیب کو سمندر میں غرق کرنے کے قابل سمجھتے ہیں اور شاید ساتھ ہی وہاں کے باشندوں کو بھی۔

اس امن پسند یورپ میں بھی مذہبی انتہا پسندوں کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ یورپ کے بڑے شہروں میں تارکین وطن بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر تو وہاں جذب (assimilate) بھی ہو رہے ہیں لیکن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہاں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی۔ انگریزی ادیب حنیف قریشی کے مشہور افسانے 'میرا بنیاد پرست بیٹا' میں ایسی ہی صورتِ حال پیش کی گئی ہے جہاں ایک ٹیکسی ڈرائیور باپ تو انگلستان کی سوسائٹی میں گذارا کر لیتا ہے لیکن اس کا بیٹا تہذیبی بےگانگی کا شکار ہو کر اپنی مذہبی جڑوں کی تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے۔ یورپ اور امریکا میں بس جانے والے مسلمان تارکینِ وطن کے ہاں اور بھی کئی طرح کے تضادات نمایاں ہو رہے ہیں۔ اسی یورپ میں بہت سے علمائے کرام بھی اپنے اپنے فرقوں اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے ساتھ جا پہنچے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو برطانیہ اور فرانس میں شریعت کے نفاذ کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ ان یورپی ریاستوں کا قصور یہ ہے کہ وہ ہر سال لاکھوں غیر ملکیوں کو شہریت دیتے ہیں۔ کیا یورپ میں نفاذِ شریعت کے حامی یہ علماء اور ان کے چیلے سعودی عرب یا کسی اور عرب ملک میں جا کر، شہریت تو دور کی بات، اپنے خیالات کی تبلیغ بھی کرنے کا سوچ سکتے تھے۔ مغرب میں صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی کا فلسفہ مروج نہیں، اور بھی کئی سیاسی فلسفے باہم مزاحم

ہیں، لیکن ان سب کی بنیاد عقلیت پسندی پر ہے۔ یہاں یہ بحث میرے موضوع سے باہر ہے کہ ہمارا نظریۂ علم اور نظریۂ حقیقت کس کس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں اور کس کس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے؛ لیکن ایک تہذیب، جو سیکڑوں سال کی فکری روایت کی وارث ہے، کیسے یہ گوارا کر لے گی کہ ایک پرائی تہذیب صرف اپنے تارکین وطن کی بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر اس کی فکری نہج اور اس کے سیاسی، قانونی اور ریاستی اداروں کی ہیئت تبدیل کر ڈالے؟ اگر ہمارے مذہب پسند وہاں اپنی سرگرمیاں بڑھائیں گے تو انھیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ بہ قول انور شعور 'اگر تم گالیاں دوگے تو کیا چپ سادھ لوں گا میں؟'

تو یہ ہے جواب ہمارے اس سوال کا کہ: why do they hate us?

رہی یہ بات کہ اگر امریکا اور یورپ گھوم کر یہی سوال ہمارے بارے میں کریں گے کہ: why do they hate us? تو ہم انھیں ان کی نوآبادیاتی تاریخ بتائیں گے جس میں اپنی نوآبادیات کے ساتھ برطانیہ کا رویہ بدتھا، فرانس کا بدتر اور امریکا کا بدترین۔ ہم انھیں بتائیں گے کہ مسلمان اکثریت کے ملکوں میں عوام کی پسندیدہ حکومتیں قائم نہیں ہیں اور اگر کہیں جمہوریت لانے کی کوشش کی گئی تو مغرب نے اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کی مخالفت کی۔ الجزائر کی مثال سب کے سامنے ہے جس کے لاکھوں مقتولین کا خون امریکا اور فرانس کی گردن پر ہے۔ حال ہی میں عرب بہار کا غلغلہ بلند ہوا تو بحرین کے لیے ایک معیار اپنایا گیا اور شام کے لیے دوسرا۔ ہم انھیں بتائیں گے کہ نائن الیون میں مرنے والے تین ہزار افراد کے انتقام میں عراق میں ایک لاکھ گیارہ ہزار آٹھ سو پچاسی (حوالہ: ویب سائٹ عراق باڈی کاؤنٹ، نو اپریل ۲۰۱۳ء) افغانستان میں ستائیس ہزار اور پاکستان میں پینتیس ہزار سے زائد افراد مارے جا چکے ہیں۔ افغان معیشت پتھر کے دور میں ہے جبکہ عراق اور پاکستان کو بھی اربوں ڈالر کا نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں یہ امریکا کا اتحادی بھی ہے، مگر بدلے میں اسے ۳۵ ہزار اموات، ڈومور کے مطالبے، اربوں ڈالر کا معاشی نقصان، آئے روز کی اقتصادی بندشیں اور جنرل پرویز مشرف بھی تحفے میں ملے۔

یہ تو ہوئی عالمی سیاسی صورتِ حال پر ڈیڑھ بات۔ اب تھوڑی سی بات آج کی فکری فضا کی بھی ہو جائے جس کا کچھ نہ کچھ پتا ہمارے ادیبوں کو بھی ہونا چاہیے۔ سرد جنگ کے زمانے تک تو دنیا میں دو ہی نظام آمنے سامنے تھے: سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت۔ اشتراکیت کی فتح کے بعد امریکی نیوکونز نے نئے اہداف کی تلاش شروع کی۔ سیموئل ہننگٹن نے 'تہذیبوں کا تصادم' نامی کتاب لکھی جو ہمارے ہاں کے مذہبی انتہا پسندوں کو بہت پسند آئی۔ مذہبی انتہا پسندوں کے ان نئے محبوبوں کا نمونۂ کلام دکھانے کے لیے صرف اس بات کا تذکرہ کر دوں کہ مشہور نیوکون رہنما جینی کرک پیٹرک (Jeane Kirkpatrick) نے ایک مرتبہ اس بات کی سفارش کی کہ امریکا کے لیے بہتر یہی ہے کہ جمہوریت کے قیام کے لیے بہت زیادہ واویلا نہ کرے اور ایسی آمریتوں کی حمایت میں کوئی عار نہ سمجھے جو امریکی حکومت کا دم بھرتی ہوں۔

اس سے پہلے امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ کا اپنے وقت کے ایک ڈکٹیٹر اناستاسیو سوموزا سے متعلق یہ جملہ بہت مشہور ہوا تھا کہ "سوموزا کتیا کا بچہ ہوا کرے؛ وہ ہمارا کتیا کا بچہ ہے۔" کچھ ایسے ہی بچوں کی پرورش امریکا نے دنیا بھر میں کی جن میں ہمارا ملک پاکستان بھی شامل ہے۔ دنیا بھر میں امریکی مظالم اور ارذل ترین ڈکٹیٹروں کی حمایت میں امریکا کے وہ عناصر پیش پیش رہے جنھیں آج نیو کونز کہا جاتا ہے۔

امریکا میں اشتراکیوں کو تو میکارتھی ازم کے ذریعے پہلے ہی غدار قرار دلوایا جا چکا تھا، مگر پھر وہاں ایک نئی لہر لبرل ازم کے خلاف بھی چلی۔ یہاں پچھلے چند سال سے 'لبرل فاشسٹ' کی ایک اصطلاح بہت معروف ہے اور جو بھی طالبان اور مذہبی انتہا پسندوں کی مخالفت میں آگے بڑھتا ہے اس پر بلا سوچے سمجھے تھوپ دی جاتی ہے۔ کسی بھی زمانے میں معروف سیاسی اصطلاحوں کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ انھیں نہ جاننے کی صورت میں آپ وہ شخص بن سکتے ہیں جو ایک اور شخص کے پیچھے اس لیے بھاگ رہا تھا کہ اُس نے اُسے چھ روز پہلے گینڈا کہا تھا، اور گینڈا اس نے آج ہی دیکھا تھا۔

پانچ سال پہلے نیو کونز کے ایک ہونہار بروا جوناہ گولڈ برگ نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا عنوان تھا: لبرل فاشزم۔ اس کتاب میں اس نے لبرل ازم کی بھد اڑائی تھی اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ وسطی یورپ میں ابھرنے والی فاشزم کی تحریکوں کو بھی لبرل مفکرین کا تعاون حاصل تھا۔ اس کتاب کا مارکیٹ میں آنا تھا کہ نیو کونز کے ہاتھ میں ایک فقرہ آ گیا۔ اب وہ اپنے مخالفین کو لبرل فاشسٹ کہنے لگے۔

دنیا میں انسانی حقوق، جمہوریت اور مساوات جیسے تصورات کو پروان چڑھانے میں لبرل سلسلہ فکر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ہر سلسلۂ فکر اپنے ساتھ کچھ سائیڈ ایفیکٹس بھی لے کر آتا ہے۔ سوشلزم کے بانیوں کی نیک نیتی سے کسے انکار ہوگا، لیکن اسی کے نام لیواؤں نے دنیا میں بدترین آمریتیں بھی قائم کیں۔ معاشی لبرل ازم نے دنیا میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم پیدا کی جس کی بدولت آج دنیا شمال کے چند امیر ملکوں اور جنوب کے کئی غریب ملکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لبرل ازم اور خصوصاً معاشی لبرل ازم کا جواب بھی مغرب ہی سے آیا ہے، سو وہاں لبرٹیرین ازم اور نراجیت (anarchism) جیسے تصورات کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ آج چومسکی اور دیگر مفکرین جس لبرٹیرین فکر کی بات کرتے ہیں اس نے بھی لبرل ازم سے بہت اخذ و استفادہ کیا ہے۔ لبرٹیرین فکر ریاست کے اختیارات کو محدود اور انسان کی آزادیوں کو وسیع تر کرنا چاہتی ہے۔ پھر اختلافی ڈسکورس کو برداشت کرنے کا ماحول بھی مغربی لبرل ازم ہی کی دین ہے، ورنہ مذہبی اور سوشلسٹ ریاستوں میں اس کا تصور بھی محال تھا۔ امریکا، برطانیہ اور فرانس جب اپنی نو آبادیات پر ظلم ڈھاتے ہیں تو انھی کے اندر برٹرینڈ رسل اور ژاں پال سارتر بھی پیدا ہوتے ہیں جو ان زیادتیوں پر احتجاج کرتے ہیں اور ان کی حکومتیں انھیں پھانسی پر نہیں چڑھاتیں، نہ ہی سائبیریا بھجواتی ہیں۔ امریکا ویت نام میں لاکھوں افراد کو قتل کرتا ہے تو خود امریکا میں ہی جنگ مخالف تحریک بھی جنم لیتی ہے۔ لبرل معیشت دانوں کا سرمایہ دارانہ نظام جب ملٹی نیشنل کمپنیوں کو تحفظیت

Scanned with CamScanner

(protectionism) کے نام پر بیل آؤٹ کرتا ہے تو خود امریکا ہی کے اندر سے تو جوانوں کی ایک تحریک بھی سامنے آتی ہے جو اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ یہ متضاد سلسلہ ہائے فکر اور ان کی متصادم حرکیات ایک زندہ معاشرے کی دلیل ہیں۔ دوسری جانب سعودی عرب کو دیکھ لیجیے۔ فی کس آمدنی میں دنیا کے امیر ترین ملکوں کے ہم پلہ، لیکن معاشرہ کسی بھی قسم کے تحرک سے محروم۔ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔ یہ جو مغرب میں ہمیں اتنے متضاد نظام ہائے فکر ایک دوسرے سے پر امن طریقے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ روشن خیالی کی وہی روایت ہے جو پچھلے کئی سو برس سے مغرب میں پروان چڑھ رہی ہے۔

کسی مخالف کی پگڑی اچھالنے کی خواہش تسلیم لیکن فکری مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کو بددیانتی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں عموماً لبرل ازم کا مطلب سیاسی رویوں میں اعتدال لیا جاتا ہے۔ ہم اپنے معاشرے میں ایسے فقرے بھی سنتے ہیں کہ 'میں لبرل مسلمان ہوں'۔ مگر درحقیقت لبرل ازم ایک سیاسی و معاشی سلسلۂ فکر کا نام ہے جس سے وابستہ مفکرین کے خیالات ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ جان لاک سے لے کر اب تک لبرل سلسلہ فکر نے کئی جہانوں کی سیر کی ہے۔ پھر یہ ہے کہ یہ سلسلۂ فکر یورپ میں کئی سو برس کی فکری جدلیات کا امین ہے، دو فقروں میں اسے رد کرنے کی خواہش کو معصومیت ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں جو مفکرین اور کالم نگار مذہبی بنیادوں پر دہشت گردی کی مخالفت کرتے ہیں، جو اقلیتوں، خواتین اور پچھڑے ہوئے طبقے کے حامی ہیں، ضروری نہیں کہ انھوں نے لبرل فلسفے سے بھرپور آگاہی بھی حاصل کر رکھی ہو۔ مذہبی دہشت گردی کے مخالفین میں تو کئی سوشلسٹ فکر کے بھی حامل ہیں۔ کئی اسلامی فکر کے کسی نہ کسی سلسلے سے بھی منسلک ہیں جن میں جاوید احمد غامدی اور شہید ڈاکٹر فاروق خان جیسے جامع العلوم سکالر بھی شامل ہیں اور مولانا حسن جان شہید اور مفتی سرفراز احمد نعیمی شہید جیسے جید علمائے کرام بھی۔ تو کیا مذہبی دہشت گردی کے ہر مخالف پر لبرل فاشسٹ کا لیبل چسپاں کر دیا جائے گا؟ کیا انھیں ان تمام جرائم کا حامی قرار دے دیا جائے گا جن میں مغرب کے لبرل سلسلہ فکر کے وارث مبینہ طور پر ملوث رہے؟ کیا یہ خود فاشزم کی ایک نئی صورت نہیں؟ ہاں ان لوگوں کو فاشسٹ کہا جاسکتا ہے جن کی روشن خیالی ملک بھر میں عشرت کدے کھول دیے جانے اور داڑھی والے تمام انسانوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کی خواہشات تک محدود ہے اور جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی ڈکٹیٹر کی حمایت پر بھی کمربستہ ہیں۔ سر پر بھرا ہوا گلاس رکھ کر ناچنے کی صلاحیت روشن خیالی کی دلیل کہاں سے ہوگئی؟ ان لوگوں کو فاشسٹ کہا جاسکتا ہے، مگر لبرل نہیں۔ انھیں کیا معلوم لبرل ازم یا کوئی بھی دوسرا فلسفہ کس چڑیا کا نام ہے؟ یہ وہی عناصر ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کی آئین شکنی کے خلاف جب اُس پر مقدمہ چلانے کی بات ہوتی ہے تو اس کے حق میں دلیلیں تراشنے لگتے ہیں۔ یہ وہی عناصر ہیں جنھیں مصری فوج کے ہاتھوں محمد مُرسی کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹے جانے پر خوشی ہوئی ہے۔ دہرے معیار رکھنے والے ان عناصر کو کسی طور لبرل

نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بجائے انھیں صرف فاشسٹ کہہ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کوئی بھی شخص جو جمہوریت کو بہ طور اصول عزیز رکھتا ہے، اسے مصر میں جمہوریت بھی اتنی ہی عزیز ہونی چاہیے جتنی پاکستان میں۔ ایسی ہی منافقت ہماری اسلامی جماعتیں بھی دکھاتی ہیں جب وہ شام اور مصر میں جمہوریت کی حمایت کرتی ہیں لیکن جب بحرین اور سعودی عرب میں جمہوریت کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو اسے خطے میں عدم استحکام کی سازش قرار دینے لگتی ہیں۔ سیکولر فاشسٹ ہوں یا سیاسی اسلام کے شائق، دونوں اپنی کھلی جانب داری میں سب سے پہلے اصولوں اور دانش ورانہ دیانت داری کا خون کرتے ہیں۔

جہاں مغرب کے لبرل اور کنزرویٹو ڈسکورس کو خود مغرب میں ہی چیلنج کیا جا رہا ہے وہاں اسلامی دنیا، مغربی دنیا کے اس غالب سیاسی ڈسکورس کے متوازی اپنا کوئی ایسا ڈسکورس سامنے لانے میں اب تک ناکام رہی ہے جو اپنی فکریات میں ہی قابلِ عمل نظر آتا ہو۔ اقبال کے خطبات کا مجموعہ ''اسلام میں مذہبی فکر کی ترتیبِ نو'' ایسے ہی ڈسکورس کی کوشش تھی۔ ہاں مصر اور سعودی عرب سے القاعدہ کی فکر ضرور پھوٹی ہے، جس نے اب تک سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی نقصان پہنچایا ہے۔ اگر اس فکر کو کوئی مغرب کے لبرل ڈسکورس کے مقابل کھڑا کرنے کا حامی ہے تو اسے یہی کہا جا سکتا ہے کہ بھائی سلسلۂ فکر تو وہ امپورٹ کیا جائے جو اپنی پیدائش کی سرزمین پر قابلِ عمل ثابت ہو چکا ہو۔ اس فکر کی رو سے پہلے تو مسلمان آپس میں لڑ بھڑ کر فیصلہ کریں گے کہ مغرب اور اس کی فکر سے لڑنا کس کو ہے۔ اس کے بعد جو مسلمان بچیں گے، اگر وہ بچے، تو وہ مغرب کو مشرف بہ اسلام کریں گے جس کے بعد راوی چین ہی چین لکھے گا۔

بات ہو رہی تھی امریکا میں کنزرویٹو مفکرین اور لبرل بائیں بازو کے اختلاف کی، جس میں نیو کونز کو 'لبرل فاشزم' کی ترکیب ہاتھ آئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان نیو کونز کے پسندیدہ فقرے کو پاکستان میں اڑایا بھی تو کس نے؟ انھی مذہبی انتہا پسندوں اور ان کے فکری ہم نواؤں نے جن کے خلاف امریکا نے 'وار آن ٹیرر' شروع کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سال سے مظلوم بنگالیوں، بلوچوں، مذہبی اقلیتوں، پچھڑے ہوئے طبقوں اور ڈرون حملوں کے شکار مظلوموں کی حمایت میں آواز بلند کرنے والی عاصمہ جہانگیر کو تو آج لبرل فاشسٹ قرار دیا جا رہا ہے جبکہ خود مقرر کردہ صحافتی مفتیوں اور ان کے غیرت بریگیڈ نے امریکی نیو کونز کا ایسا فرنچائز پاکستان میں کھولا ہے کہ مذہبی انتہا پسندی کے ہر مخالف کے لیے 'لبرل فاشسٹ' کا تمغہ انھی کے آؤٹ لیٹ سے برآمد ہوتا ہے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا لبرل مفکر کارل پوپر (Karl Popper) ریاستی اداروں کی تشکیل کے دوران ریاست کے 'اخلاقی ڈھانچے' کو سب سے زیادہ اہمیت دینے کا حامی تھا۔ اپنی کتاب 'ایک بہتر دنیا کی تلاش' (In Search of a Better World) میں اس نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ کسی ریاست کا 'قانونی ڈھانچہ' اس ریاست کے 'اخلاقی ڈھانچے' سے مطابقت رکھے گا۔ کیا ہماری ریاست کا اخلاقی ڈھانچہ ریاست کے غالب مذہب اسلام پر مبنی نہیں؟ اگر ہے تو مذہبی انتہا پسندوں کو ملک کی چھیانوے فی صد

آبادی پر عدم اعتماد کیوں ہے؟

آج فکری محاذ پر امریکا کے جنگ پسند نیو کونز اور پاکستان کے کچھ سیاسی و صحافتی پاک باز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس نظریاتی اتحاد میں ہندوستان کے ہندو انتہا پسند بھی ان کے شریک ہیں ۔ سو دنیا بھر کے انتہا پسند نظریاتی طور پر تو متفق ہیں لیکن جب بات دشمن کی شناخت کی آتی ہے تو کسی کو یہ دشمن ہرے رنگ کا نظر آتا ہے، کسی کو سرخ رنگ میں اور کسی کو سیاہ رنگ میں۔ یہ لوگ نظریاتی طور پر اتحادی ہیں اور عملی طور پر دشمن؛ اور ان نظریاتی اتحادیوں کی عملی لڑائی میں پوری دنیا کے معصوم عوام گھن کی طرح پس رہے ہیں۔

بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کر دوں کہ کچھ ایسے معصوم مارکسی بھی ہیں جنھیں لبرل فلسفے سے خدا واسطے کا بیر تھا، سو انھیں بھی اپنے نظریاتی مخالفین پر منطبق کرنے کے لیے 'لبرل فاشسٹ' کی اصطلاح پسند آئی اور وہ یہ بھول گئے کہ جوناہ گولڈ برگ کی کتاب کا ذیلی عنوان تھا: ''امریکی بائیں بازو کی خفیہ تاریخ''، مگر شاید امریکی بایاں بازو بھی چونکہ 'امریکی' ہے اس لیے ان معصوم مارکسیوں کے نزدیک نا مطلوب ہے۔

یہ ہے وہ عالمی صورتِ حال اور وہ فکری فضا جس سے کچھ نہ کچھ آگاہی ہمارے ادیبوں کو ہونا چاہیے تھی، لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ شاعر ادیب کتابیں تو کیا اخبار بھی نہیں پڑھتے۔ اوپر سے فیس بک کی آمد کے بعد ہر شاعر، ادیب کو کبھی نہ کبھی کسی سماجی، سیاسی یا مذہبی معاملے پر جب کومنٹ کرنا پڑ جاتا ہے تو اس کی علمی معصومیت عیاں ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اگر انھیں اس معصومیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ان کے اندر کا 'داہ جماعت پاس، ڈائریکٹ حوالدار' سامنے آجاتا ہے۔

نائن الیون کے بعد پاکستان کئی حوالوں سے تبدیل ہوا۔ جب نائن الیون ہوا تو ہمارے ملک پر ایک بار پھر ایک فوجی حکمراں مسلط تھا۔ نائن الیون ہوتے ہی گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ بل کلنٹن ہمارے نئے بزرجمہر کا حال تک نہ پوچھتے تھے اور کہاں یہ وقت آیا کہ واشنگٹن اور جی ایچ کیو کے درمیان ہاٹ لائن قائم ہوگئی۔ جس حکمراں نے ہماری قوم کو مشرف بہ پرویز کیا تھا وہ اندرونِ ملک تو لوگوں کو 'ککّ' مارا کرتا تھا جبکہ بیرونِ ملک 'فاختہ' کہلاتا تھا۔ مختلف اقسام کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا اس حکمراں نے پاکستان کا وہ حال کیا جو وہ بندر کرتا ہے جس کے ہاتھ میں استرا آجائے۔ ہمیں وہ جنگ لڑنی پڑی جو جب شروع ہوئی تھی تو ہماری نہیں تھی۔ اور اس جنگ میں اب تک پاکستان کے پینتیس ہزار سے زائد بیٹے اور بیٹیاں قربان ہو چکے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ستم کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ امریکا جن مذہبی انتہا پسندوں اور جنگجوؤں سے لڑ رہا تھا، انھوں نے امریکا کا بدلہ پاکستان کے عام شہریوں سے لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان جہاں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد افغان عوام سے ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ پاکستانیوں نے متحدہ مجلس عمل کو بڑھ چڑھ کر ووٹ دیے تھے، اسی پاکستان کو دہشت گردوں نے زخموں سے چور چور کر دیا۔ اگر جنگ

جوؤں کو پاکستان کی سرکاری پالیسی سے حساب چکانا ہوتا تو وہ صرف سرکاری اداروں اور سپاہیوں کو نشانہ بناتے۔ لیکن ایک خاص کلچر کے حامی ان جنگ جوؤں کو زندگی کی عام خوشیوں میں خوش ہوتے، شادی بیاہ پر ناچتے، مزاروں پر دھمالیں ڈالتے، مجلسوں میں ذکر اہل بیت سنتے، محفلوں میں درود و سلام پڑھتے پاکستانیوں کے طریقہ زندگی سے بھی نفرت تھی۔ اس نفرت کی قیمت پاکستان نے ادا کی۔ ہماری فوج کے جتنے سپاہی، جتنے افسران جنگ جوؤں کے ہاتھوں مارے گئے اتنے بھارت کے ساتھ چار جنگوں میں بھی نہیں مارے گئے تھے۔ لیکن پھر ان جنگ جوؤں کو اسی زخم زخم وطن سے اپنے ہم نوا اور غم گسار بھی مل گئے۔ وہ غم گسار جو کہتے تھے کہ خودکش حملے اس لیے ہو رہے ہیں کیونکہ ڈرون حملے نہیں رک رہے۔ کسی نے مڑ کر یہ نہ پوچھا کہ مجلسوں، مزاروں اور درباروں پر خودکش حملوں میں قتل ہونے والے معصوم لوگوں کے کتنے لواحقین خودکش بنے؟ دہشت گردی کی جنگ امریکا کے خلاف تھی تو پاکستان کے نہتے شہریوں کا قتل عام کیوں شروع ہو گیا؟ ہزارہ قبیلے کو کیوں ریڈ انڈین بنا دیا گیا جو ہر سال ستائیس رمضان کو یوم القدس منا کر مرگ بر امریکا، مرگ بر اسرائیل کے نعرے لگایا کرتا تھا؟ صدیوں سے اپنی قبر میں سویا ہوا رحمان بابا بھی کیا امریکا کا پٹھو تھا کہ اس کا مزار بم سے اڑا دیا گیا؟ یہ وہ سوال تھے جنھوں نے بہت سے ادیبوں، شاعروں کو تنگ کیا، مگر بہت سے ادیب، شاعران حالات میں بھی قافیے پر قافیہ ہی ٹانکتے رہے۔

آج مجھے ان شاعروں کا ذکر کرنا ہے جنھوں نے بدلے ہوئے اس پاکستان کا درد اپنی شریانوں میں محسوس کیا۔ یہی وہ شاعر ہیں جن کا ہاتھ اپنے زمانے کی نبض پر ہے اور یہی وہ شاعر ہیں جن کی شاعری میں روحِ عصر کا ہیولہ ابھرتا ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔

اب جب کہ میں ادیب کے لیے سماج سے واقفیت اور روحِ عصر کی شناخت کی اس قدر حمایت کر چکا ہوں تو وقت آ گیا ہے کہ میں یہ بھی اعلان کر دوں کہ اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے بس یہی دو چیزیں کافی نہیں۔ انسان کے دکھ سکھ بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب شہر کے کسی چوک میں ہونے والے بم دھماکے یا کسی ڈرون حملے پر براہ راست نہ لکھ رہا ہو لیکن ایسی المناک مصیبتوں سے پیدا ہونے والا دکھ، مایوسی اور انسانی المیہ اس کی تحریروں میں در آیا ہو۔ ادب کے لیے جو اہمیت سماجی تبدیلیوں اور روحِ عصر کی شناخت کی ہے، اتنی ہی اہمیت، اگر اس سے زیادہ نہیں تو، تاریخ اور انسان کی ازلی ابدی کہانی کی جان کاری کی بھی ہے۔ ادیب آج کے حالات کو، یا کسی ایک انسان کی کہانی کو، جب ابدیت کے پہلو میں رکھ کر دیکھتا ہے تو تبھی اس کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے؛ ورنہ اس کی تحریر ایک کومنٹ بن کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کے بڑے ادیب وہی ہیں جنھوں نے انسانی دکھ سکھ کو مجموعی زندگی بلکہ ابدیت کے پہلو میں رکھ کر دیکھا اور دکھایا۔ پھر یہ بھی ہے کہ بہ قول جون ایلیا ہماری دنیا رشتوں کا ایک کارخانہ ہے جس میں ایک کل دوسری کلوں سے جڑ کر ہی اپنی شناخت اور اپنے معنی پیدا کرتی ہے۔ سماج فرد پر اور فرد سماج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر افراد اپنے باہمی رشتوں کی مدد سے ایک دوسرے پر اثر

Scanned with CamScanner

انداز ہوتے ہیں۔ ادب اور شاعری کا بنیادی موضوع انھی رشتوں کا تصادم اور تال میل ہے۔ ہمارے جذبات اور محسوسات کسی نہ کسی رشتے سے ہی پیوست ہوتے ہیں۔ اسی سے انسانی المیہ بھی جنم لیتا ہے اور انسانی تماشا بھی۔ اینا کارینینا کیا ہے؟ کہانی تو بس اتنی سی ہے کہ ایک عورت ہے جو ایک عدد شوہر رکھنے کے باوجود بے قرار ہے اور ایک ایسے محبوب کے عشق میں مبتلا ہے جسے وہ نہ پا سکتی ہے نہ چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن ساڑھے آٹھ سو صفحے کی یہ کہانی ہمیں اس عورت کے اتنے پہلوؤں سے ملواتی ہے کہ ہم اینا کو ایک جیتی جاگتی عظیم عورت سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی اور کا تو پتا نہیں، لیکن مجھے تو اینا کسی عام عورت سے زیادہ ہی یاد آتی ہے۔ خدا کی تخلیق کے بالمقابل ایک اور تخلیق؛ ویسی ہی جیتی جاگتی، لیکن کہیں زیادہ یادگار۔ بیابان و کہسار و راغ آفریدی۔ خیابان وگلزار و باغ آفریدم۔

مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ ادب کو اعلیٰ ادب بنانے کے لیے انسانی تاریخ، ازلی ابدی انسانی المیہ اور انسانی تماشا، رشتوں کا تصادم اور تال میل سب کی جان کاری اور گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ لیکن جب کسی قوم پر کوئی بڑی افتاد آتی ہے تو مذکورہ بالا تمام عناصر کی ہیئت اور معنی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد پاکستان پر بھی ایسی ہی افتاد پڑی ہے۔ یہ مضمون بھی اسی افتاد اور اس کے پس منظر کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اور یہ کوشش بھی میری محدودات سے جڑی ہوئی ہے، اس لیے جیسی بھی ہے نا مکمل ہے۔ ہمیں تو اس افتاد سے متعلق ایک پورے ڈسکورس کی ضرورت ہے؛ اور ادب کسی بھی ڈسکورس کی روح ہوتا ہے۔

(۲)

سماج سے جڑا ہوا شاعر اگر اپنے زمانے پر صرف کومنٹ ہی کر رہا ہے تب بھی اس کے کچھ دیر زندہ رہ جانے کا امکان کافی ہے، کیونکہ بعد کے زمانوں کے لوگ اس کی شاعری میں سے کم از کم موٹھ و مٹر کے دام تو معلوم کر ہی سکتے ہیں۔ ڈینیل ڈیفو نے اپنے زمانے میں بہت سی تحریریں لکھیں، لیکن 'رابن سن کروسو' کے علاوہ اگر اس کی کوئی چیز آج بھی زندہ ہے تو وہ لندن کی آتشِ عظیم کا احوال ہے۔ اگر ادیب اپنے عصر اور اپنے لوگوں کا احوال دیانت داری سے بیان کر دیتا ہے تو وہ کسی نہ کسی حد تک اپنا کام پورا کر دیتا ہے۔ لیکن بڑی شاعری اور بڑا ادب وہی ہوگا جس میں سماجی جان کاری، روحِ عصر کی تلاش اور ابدیت کے پہلو میں انسان کے دکھ سکھ کا حال بیان کیا گیا ہوگا۔ مضمون کے دوسرے حصے میں میری کوشش ہوگی کہ ایسی ہی کچھ شاعری سے آپ کا تعارف کرایا جائے۔

پہلے ذکر اس اکیلے شاعر کا جس کی اٹھان نئی منزلوں کا پتا دے رہی تھی۔ ڈاکٹر جاوید انور، جو رہتا تو یورپ میں تھا لیکن سانس اپنی ہی دھرتی پر لیتا تھا، کی کتاب 'بھیڑیے سوئے نہیں' ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔ جاوید انور نے اپنی دھرتی، اپنے لوگوں پر ہونے والے دو دھاری ستم کی ایک دھار کو خاص طور پر

بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ذرا ان لائنوں کو دیکھیے۔ آپ کو ایک بے بس شخص ایک بدمست ہاتھی جیسی عالمی طاقت کو للکارتا نظر آئے گا۔ ساتھ ہی قرآنی تلمیحات کے ذریعے آج کے زبردست کو چیلنج بھی کیا جا رہا ہے۔

ابابیلیں ابھی زندہ ہیں ظالم ہاتھیوں والو
کہ نفرت وہ توانائی ہے جو ذرے کو ایٹم بم بناتی ہے
ادھر دیکھو
پہاڑوں پر،
بیابانوں میں، صحراؤں میں، جو بھی ہے
(محبت بھی)
سبھی نفرت سے تم پر تھو کتے ہیں
(لڑ نہیں سکتے)
بظاہر لڑ نہیں سکتے
مگر دیکھو
وہ کعبے جو دلوں میں ہیں ہتھوڑوں سے نہیں ڈھیتے

دہکتے کوئلے جو پسلیوں کی دھونکنی کے اُس سرے پر ہیں
اُنھیں کیسے بجھاؤ گے؟

(انتباہ)

اسی مجموعے میں ایک نظم ہے: 'ابوعبیدہ'؛ جس کا کردار ابوعبیدہ حراروں کو پھلوں کے بجائے درختوں کی جڑوں میں تلاش کرتا ہے اور یوں سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو حلال کر ڈالتا ہے۔ ابوعبیدہ جنت کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن اسے فکر نہیں کہ:

پسِ دریچہ برہنہ پا و بدن دریدہ کھڑی ہے بنتِ ابوعبیدہ
نہ گھر میں گندم، نہ خشک انجیر اور نہ خرما
گداگر ماگلی میں دوزخ منا رہے ہیں
فرشتے چابک چلا رہے ہیں
کہ سیرِ جنت کو جا رہے ہیں ابوعبیدہ

(ابوعبیدہ)

افضال احمد سید نثری نظم کو اعتبار دینے والے شاعروں میں سب سے اہم ہیں۔ سماجی آشوب اور ماضی و حال کی تاریخ کا جبر ہمیشہ سے ان کی شاعری کا موضوع رہا ہے۔ پچھلی دہائی کے دوران انھوں نے بہت کم نظمیں لکھیں لیکن ان میں ہماری حالیہ خوں چکاں تاریخ کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔

نظم

صرف یہ جانتی ہے
اُس نے انتباہ کی مزاحمت کی تھی
اور چاہتی ہے
اُس سے تربیت حاصل کرنے والی
نوعمر لڑکیاں
اپنی مشق جاری رکھیں

(بونیر اسٹریٹ کی رقاصہ)

عذرا عباس نے پچھلی ایک دہائی کا زیادہ عرصہ لندن میں گزارا اور وہ لندن ہمیں ان کی نظموں میں دکھائی بھی دیتا ہے۔ ایک عورت کی نظر سے لندن دیکھنا ہو تو ان کی کتاب 'حیرت کے اُس پار' پڑھیے۔ اب وہ پاکستان واپس آئی ہیں تو ان کی نظموں میں وہی عذرا عباس نظر آنے لگی ہیں جو نوے کی دہائی میں کراچی کے آشوب کو ایک عورت کی آنکھ سے دیکھتی تھیں اور اس سے اپنی نظمیں کاشت کیا کرتی تھیں۔ ان کی ایک تازہ نظم ملاحظہ فرمائیے:

میں لان میں بیٹھی ہوں
گرتے ہوئے پتوں کو گن رہی ہوں
ایک، دو، تین
ان گنت پتے
میں کمرے میں بیٹھی ہوں
خبریں سن رہی ہوں
میری گنتی میں شامل ہو جاتی ہیں
وہ لاشیں
جو درخت سے نہیں گر رہی ہیں
لاشوں کی گنتی پتوں کی گنتی سے
بڑھ جاتی ہے

(گنتی)

نصیر احمد ناصر کی تازہ نظموں میں بھی پوسٹ نائن الیون ماحول کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ پاکستان میں رہنے کے باعث انھیں اپنی دھرتی کے باسیوں کی بپتا سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مظلوموں کے لبادے میں کون ظالم چھپا بیٹھا ہے، دھرتی سے جڑے ہوئے شاعر کو سب معلوم ہے۔ سو نصیر احمد ناصر کے سوال دھرتی کے سوال بن کر سامنے آتے ہیں:

میں کسی اور سے نہیں تو موت سے ضرور پوچھوں گا
کہ ان جنے بچوں کو
کس خدائی قانون کی رو سے رحم بدر کیا گیا
اور بارودی سرنگیں
کس فرشتے کی ایجاد ہیں
اور وہ جنت کیسی ہوگی
جو خودکش دھماکوں کے بدلے میں ملتی ہے
اور کیا جہنم کے لیے
آسمان پر کوئی جگہ نہیں بچی تھی

(اگر مجھے مرنا پڑا)

پچھلے دنوں **احمد جاوید** کی نثری نظموں کی کتاب ''آندھی کا رجز'' منظر عام پر آئی۔ احمد جاوید اُن دنوں کراچی کی محفلوں کا حصہ تھے جن دنوں نثری نظم کی ابتدائی بحثیں شہر کی ادبی فضا کا خاصہ تھیں۔ مگر اس کتاب میں ان کی نظموں کا مزاج دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہت نئی نظمیں ہیں۔ احمد جاوید نے اس کتاب میں نثری نظم کا ایک نیا ذائقہ دیا۔ ان کے ہاں غصے کے بہت سے رنگ انھیں نثری نظم کے دیگر شاعروں سے ممتاز بھی کرتے ہیں اور ہمیں ایک نئی حیرت سے بھی روشناس کراتے ہیں کیونکہ بظاہر وہ اتنے غصہ ور لگتے نہیں تھے۔ انسانی جذبوں میں سے غصہ ایک ایسا جذبہ ہے جسے شاعری بنانا شاید کچھ زیادہ ہی مشکل ہے اور اس سے دانتے نے ہی اپنا جہنم بنایا تو بنایا۔ جب ذکر ہمارے نااہل حکمرانوں کا آتا ہے ،جنھوں نے اپنا عرصہ اقتدار عالمی طاقتوں کی دلالی میں صرف کیا ،تو احمد جاوید ایک منہ زور گھوڑے کی طرح یوں گویا ہوتے ہیں:

مگر میں کیا کروں
گالیاں بوئی نہیں جاتیں
انھیں کاٹا نہیں جاسکتا
اور مجھے خیاطی بھی نہیں آتی
انسان نے اگر صحیح سمت میں ترقی کی ہوتی

تو مجھے ان مجبوریوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا
جن کی وجہ سے میری نفرت بانجھ عورتوں کی طرح
ایک خودسوز شعلہ بن کر رہ گئی ہے

(ہجو)

ابرار احمد ایک نرم خو شاعر ہیں۔ ان کی نظم ایک سبک خرام چشمے کی طرح دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آتی ہے اور آپ کے مساموں میں داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن سیاسی وسماجی آشوب نے اس نرم خو شاعر کے لفظوں میں بھی کانٹے اگا دیے۔ ورنہ، بہ قول منیر نیازی، اک شاعر کے دل میں اس قدر نفرت کہاں۔ ایک زندہ معاشرہ مکالمے سے توانائی حاصل کرتا ہے، لیکن جہاں مکالمے ہی کا در بند کر دیا جائے اور اس کی جگہ فتویٰ بازی کا بازار گرم ہو جائے تو وہاں یہ کہنا ہی پڑتا ہے:

لکھ کھلے دہانوں میں جہنم کی آگ ہے
اور گدلی انتڑیوں میں کیچ کھولتا ہے
سجی ہوئی میزوں پر حریص معدے الٹ جاتے ہیں
ماتھوں پر دعائیں داغ بن جاتی ہیں
اور آہنی دانتوں میں دل چبا دیے جاتے ہیں
باتوں کی آگ سے ہونٹ سیاہ ہو جاتے ہیں

(وچ مرزا یار پھرے)

جیلانی کامران کی ایک طویل نظم 'باغِ دنیا' کا ذکر ہمارے ادبی ڈسکورس میں بہت کم ہوتا ہے، حالانکہ اپنے شعری ڈیزائن میں 'باغِ دنیا' اردو کی کسی اور بڑی نظم سے کم نہیں۔ اس طویل نظم میں 'احیا' نام کا ایک کردار ہے جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہماری نظموں میں ایسے اور بہت سے کردار کیوں نہیں جو ہمارے اپنے لسانی کارپس (corpus) سے نکلے ہوں۔ ن م راشد کا حسن ایسا ہی ایک کردار تھا، لیکن اس کا تذکرہ بہت ہوا، 'احیا' کا نہیں ہوا۔ علی افتخار جعفری کی ایک نظم میں 'سدا بہار' نامی کردار کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے ہی وہ اپنی غزلوں کے ایک خوب صورت مجموعے کے ساتھ سامنے آئے تھے۔ ان سے کتنی ہی امیدیں تھیں جو ان کی بے وقت موت نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ اپنی وفات سے کچھ ماہ پہلے انھوں نے اپنی ایک نظم فیس بک پر لگائی تھی۔ اس نظم میں معنی کی چمک دمک بھی دیکھنے والی ہے اور شاعر کے دلیر لفظوں کے تیور بھی:

سدا بہار چشمِ نم کا حوصلہ جواب دے گیا
زمین تھک گئی بدن کے چیتھڑے سنبھالتے

ترے نواح جنت البقیع بن گئے سدابہار
نہر عسل وکاہِ مخملیں کے وہم سے نکل
یہ وقت ہے خروج کا
سدابہار، ہم اجل گزیدگاں کا خون اپنے منہ پہ مل
کلام کر
قیام کر
(سکوت جرم ہے)

جمیل الرحمان پاکستان سے باہر رہتے ہیں لیکن ہمارے آشوب پر دن رات کڑھنا ان کے معمولاتِ شب و روز میں شامل ہے اور اس کا اظہار وہ فیس بک پر بھی کرتے رہتے ہیں۔ جمیل الرحمان ایک الگ انداز کی نثری نظم لکھتے ہیں جس میں ڈرامائیت کے ساتھ ساتھ لائنیں پروز یک بھی ہو جاتی ہیں لیکن نظم کی کلیت میں وہ اپنے اردگرد کی لائنوں کے ساتھ یک جان محسوس ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی ایک نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں انھوں نے اسلامی دنیا کے آج کے حالات کو ماضی کے تناظر میں نظم کیا ہے۔ نظم ''بے نوا تھیٹر سے ایک رواں کومنٹری'' ہمیں احساس دلاتی ہے کہ اپنے حالات پر جذباتی ہو کر کوئی منظوم یا منثور کومنٹ کر دینا ادب نہیں۔ جہاں اپنے معاشرے کی پرت در پرت تاریخ کا علم ہوگا وہاں نظم کی گہرائی اور گیرائی بھی دیکھنے والی ہوگی:

بایزید ثانی کی فوج
کل صبح
ہنگری نہیں پہنچ سکے گی
امیر تیمور کے لشکر نے
اس کا راستہ روک لیا ہے

فرڈیننڈ کے سامنے ہتھیار پھینکنے والے
کون ہیں؟
عربی، بربری، اندلسی یا مالکی؟
الحمرا کے پہلو میں بہتے
دریائے شنیل کا پانی
اپنی غیرت کی لاش اٹھائے ہوئے
دجلہ و فرات کی لہروں میں تیرتا

سندھ، راوی اور اٹک میں
کیسے آ شامل ہوا؟

(بے نوا تھیٹر سے ایک رواں کومنٹری)

وحید احمد کا شمار بھی ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جو اپنی شعری حیثیت اپنی پہلی دو کتابوں سے منوا چکے ہیں۔ پچھلے سال ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''نظم نامہ'' کے نام سے سامنے آیا۔ یہ مجموعہ آزاد نظم میں تمثال سازی کی نئی منزلوں کا گواہ ہے۔ انھوں نے لفظ گری اور تمثال سازی میں بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا ہے اور اسی دلیری سے اپنی دھرتی کی پیڑا کو بھی محسوس کیا ہے:

یہ خود کش لوگ
جن کے پیٹ پر بارود کی پٹی ہے
کیا مریخ سے آئے ہیں؟ کیا زہرہ سے اترے ہیں؟

یہیں کی خاک ہیں یہ اور یہیں کا خوں ہیں یہ بچے
خلاؤں سے نہیں آئے
یہ مروارید ناسفتہ ہیں
جو تہذیب کی ڈوری کے پہلو میں پڑے ہیں
اور دُرِ سفتہ جنھیں ٹھوکر لگاتے ہیں
کوئی جوہر کو ضرب آئے تو وہ وحشت سے پھٹتا ہے
پھر اس کے ساتھ روحیں اتنی سرعت سے نکلتی ہیں
کہ عزرائیل کی زنبیل میں کہرام مچتا ہے

(سرگوشیاں)

لیکن وحید احمد کو خود کش حملہ آوروں کی پیداوار میں اس اضافے کی وجہ بھی معلوم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ گھر میں یہ ہاتھی پالنے کا مشورہ کس نے دیا تھا اور ہم نے ان ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ کن خوابوں کی پرورش کی تھی۔ جاوید انور کے ہاتھیوں کے بعد پیش ہیں وحید احمد کے ہاتھی۔ ان میں اگر کسی کو امریکا کی ری پبلکن پارٹی کا انتخابی نشان بھی نظر آ جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بنیادی طور پر یہ ہاتھی وہ ہیں جنھیں ہم کبھی اپنا 'اثاثہ' قرار دیا کرتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ پرانے زمانے میں بادشاہ اگر کسی کو تحفے میں ہاتھی دے دیا کرتے تھے تو اسے پالنا اس کے لیے وبالِ جان ہو جاتا تھا۔

فیل بانو

گھر میں ہاتھی کون رکھتا ہے؟
ذرا تم اپنے دروازوں کے قد تو ناپ لیتے

جہاں پر فیل بانی ہو
وہاں گر چیونٹیاں پامال ہو جائیں تو حیرانی نہیں ہوتی
(ہاتھی والے)

اختر عثمان جب اپنے عصری آشوب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ہماری تہذیب کا ماضی بھی ہوتا ہے، یوں ان کی آواز اپنے عہد کے نوحے سے آگے بڑھتی ہوئی تہذیب کے نوحے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں ایک وژن کی تلاش نظر آتی ہے اور وہ انھیں راہوں کے مسافر نظر آتے ہیں جن پر ان سے پہلے اقبال، ن م راشد اور اختر حسین جعفری چل چکے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ:

روز و شب، فرقت و وصال اب مرا
تناظر نہیں رہے ہیں
(تجرید)

پچھلی صدی میں مسلمانوں نے اپنے ماضی کو شان دار بتا کر اس کی بازیافت یا باز گیری کی کوشش شروع کی تھی۔ جب تک مسلمان محکوم تھے انھیں یہ خوابِ خوش بہت راس آتا تھا، لیکن جب زمامِ اختیار خود انھی کے ہاتھوں میں آ گئی تو ماضی کی باز گیری کے خواب بھی چکنا چور ہو گئے۔ پتا چلا کہ اپنے دشمن تو ہم خود بھی ہیں۔

شکوہِ رفتہ کی باز گیری کے عہد نامے پہ دستخط
کرتی انگلیوں میں قلم نگوں ہے
غلط نویسی، دروغ خوانی کا یہ تسلسل
در لبِ بے روایت اور ابتدائے بے انتہا کا
بابِ منافقت ہے

قلم۔۔ فسانوں، گئے زمانوں کے زنگ خستہ فسوں کو
صیقل کرے تو پھر کیا
وہ زنگ تو اب ہماری نسلوں کے اُستخوانوں میں
بولتا ہے
(باز دید)

اختر عثمان نے ہمارے سماجی اور سیاسی کرب کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا ہے بل کہ اس احساس نے ان کے اظہار میں جو شعری ترفع پایا ہے وہ بھی قابلِ دید ہے۔ ایسی نظمیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ احتجاجی شاعری کا شمار ادبِ عالیہ میں نہیں ہوتا:

ابھی پچھلے جنازوں کے نمازی گھر نہیں لوٹے
ابھی تازہ کھدی قبروں کی مٹی بھی نہیں سوکھی
اگر بتی کی خوش بو سانس کو مصلوب کرتی ہے
پسِ چشمِ عزا ٹھہرے سرِ شکِ حشر بستہ میں ابھی احساس کا نم ہے
ابھی پرسے کو آئے نوحہ گر واپس نہیں پہنچے
ابھی کنزِ غمِ جاوید میں صدہا الم ہے، عرصۂ غم ہے
عزادارو! ابھی پچھلے جنازوں کے نمازی گھر نہیں پہنچے
نئے تابوت پچھلے چوک پر ہیں، نوحہ و نالہ کی لے مدھم رکھو
گل ہائے تازہ کا کوئی نوحہ نہیں کہنا (زمستاں ہے)
ابھی وہ خوش نفس واپس نہیں پہنچے
علی اصغر، علی اکبر نہیں لوٹے
ابھی قاسم کی منہدی گھولنا باقی ہے پانی آئے تو نوحہ اٹھائیں گے

(زمستاں کا نوحہ)

فہیم شناس کاظمی بھی اسی درد سے وابستہ ہیں۔ ایک آگ ہے جس کی تپش انھیں شہرِ ناپرساں کراچی میں اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں سیاسی و سماجی حالات کو شعری صورت دی ہے، لیکن ایک نظم میں وہ یہ طے کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ آگ جو پہلے معبد کے اندر محدود رہتی تھی، اب معبد سے باہر نکل آئی ہے اور اب وہی ہر چیز کو تہس نہس کر رہی ہے۔

آگ

معبد سے
خداوند کے زنداں سے سرِ شام نکل آئی ہے
اب صنم ہو کہ علم ہو کہ حرم
کوئی نہیں بچ سکتا
شاخ در شاخ چلے
شہر در شہر بڑھے
کوئی بغداد کہ تہران کہ روم

سبز پیڑوں کو

کھلونوں کو

پرندوں کو جلاتی ہوئی آگ

(آگ معبد سے نکل آئی ہے)

علی اکبر ناطق ایک اور بانکا شاعر ہے جس کو اس کے ہنر کی داد بھی بے پناہ ملی ہے۔ اس میں ہر چند اس کی قسمت کا ہاتھ ہو لیکن اس کے ہاں ایسی نظمیں موجود ہیں جو اس کے ایک تاب دار شاعر ہونے کی گواہ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے معاصر ادب کے اہم کتابی سلسلے 'دنیا زاد' میں اس کی طویل نظم 'سفیرِ لیلیٰ' شائع ہوئی جو شاید اس کی بہترین نظم بھی ہے۔ ن م راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر' نے بہت سے شاعروں سے مبارزت طلبی کی۔ راشد کی اس نظم میں راوی 'جہاں زاد' سے خطاب کرتا ہے۔ ناطق نے اپنے خطاب کے لیے 'لیلیٰ کے سفیر' کو منتخب کیا ہے۔ اس کی نظم میں کلاسیکی عربی قصیدے کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سبع معلقات کے شاعروں کی طرح ناطق اپنی نظم ایک کھنڈر پر کھڑا ہو کر شروع کرتا ہے۔ اور یہ کھنڈر اس کی تہذیب کے ساتھ ساتھ اس کے خوابوں کا کھنڈر بھی ہے۔

نظر اٹھاؤ سفیرِ لیلیٰ برے تماشوں کا شہر دیکھو

یہ میرا قریہ، یہ وحشتوں کا رہین قریہ

تمھیں دکھاؤں

یہ صحنِ مسجد تھا، یاں پہ آیت فروش بیٹھے دعائیں خلقت کو بیچتے تھے

یہاں عدالت تھی اور قاضی امان دیتے تھے رہزنوں کو

اور اس جگہ پر وہ خانقاہیں تھیں، آب و آتش کی منڈیاں تھیں

جہاں پہ امرد پرست بیٹھے صفائے دل کی نمازیں پڑھتے

خیالِ دنیا سے جاں ہٹاتے

(سفیرِ لیلیٰ ۲)

پچھلے برس جب دہشت گردوں نے سوات کی ایک چودہ سالہ بچی ملالہ یوسف زئی کو گولی کا نشانہ بنایا تو سوشل میڈیا پر ایک اور دوسری قسم کی آراء کا طوفان امڈ آیا۔ ایسے میں ادب کی ساحلی پٹی پر مقیم کچھ پناہ گزینوں نے ملالہ کا ساتھ دینے کے بجائے وقت کے حرملہ کی طرف داری کو ترجیح دی۔ لیکن بہت سے شاعروں نے بچیوں کی تعلیم کا پرچم بلند کرنے والی جواں ہمت ملالہ کے حق میں نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کا پورا ایک مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے۔ میں نمونے کے لیے صرف ایک نظم کا اقتباس پیش کروں گا جو مصطفیٰ ارباب نے لکھی۔ ملالہ پر ان کی ایک ساتھ کئی نظمیں کتابی سلسلے 'دنیا زاد' میں شائع ہوئی

Scanned with CamScanner

تھیں جن میں انھوں نے ملالہ پر ہونے والے افسوس ناک حملے کے کئی پہلوؤں کو شعری ساخت میں ڈھالا تھا۔

ہم خوشی اور غصے کا اظہار
ہمیشہ گولی چلا کر کرتے ہیں

گولی غصے کی طرح اندھی ہو جاتی ہے
وہ ملالہ سے ہوتے ہوئے
ہر ماں کو مجروح کر دیتی ہے

وہ کوکھ بھی کراہ رہی ہے
جس نے طالبان کو جنم دیا تھا

(ملالہ)

احمد آزاد کا بنیادی موضوع تو محبت اور رومان کی تلاش ہے لیکن جنگ کے دنوں میں محبت کی تلاش ان کے لیے کچھ اور بھی ناگزیر ہو جاتی ہے:

جنگ کے دنوں میں

دودھ
ڈبل روٹی
مکھن

یا
پنیر کے بجائے
ہمیں
نفرت کی فکر کرنی چاہیے

(جنگ کے دنوں میں)

دانیال طریر بھی تیزی سے ابھرتے ہوئے نوجوان ادیبوں میں شامل ہیں۔ ان کا وصف یہ ہے کہ وہ شعر و ادب سے سنجیدگی سے وابستہ ہونے کے علاوہ تھیوری کے معاملات سے بھی سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "معاصر تھیوری اور تعینِ قدر" کے نام سے سامنے آچکا ہے۔ جس میں عملی تنقید کے حوالے سے بھی ان کے مضامین موجود ہیں۔ پاکستان اور دنیا کے سیاسی حالات کا بھی وہ گہرا مطالعہ

کرتے ہیں جن کا نتیجہ ان کے تنقیدی مضامین کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ایک اہم مضمون 'مابعد نائن الیون بلوچستان کا ادب' بھی ہے۔ ان کے شعری مجموعے 'معنی فانی' میں شامل ایک نظم دیکھیے جس میں آج کا شیطانِ بزرگ صاف نظر آتا ہے:

وہ کہتا ہے
اس جانب کچھ کتے بھیجو
سونگھنے والے
بو آئی ہے
آدم زاد کی بو آئی ہے
آدم زاد کی بو سے میرا دم گھٹتا ہے
سانس کی تنگی مجھ کو وحشی کر دیتی ہے

(الرجی)

زاہد امروز ان تمام شاعروں سے کم عمر ہیں لیکن ان سے توقعات اور بھی زیادہ ہیں۔ نائن الیون کے وقت وہ ایک ٹین ایجر تھے اور پاکستان پر بیتنے والی آخری دہائی ان کی اُس عمر سے گزری جس میں انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ تا عمر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی کتاب کا نام ہی 'خودکشی کے موسم میں' رکھا۔ خودکش دھماکوں کی اس شب برات میں سوچنے کے لیے انسان کے پاس کچھ اور بہت کم بچتا ہے، لیکن ان کے ہاں ایک آزاد محبت کی تڑپ بھی بہت ہے۔ یہ تڑپ نارسائی کا کرب بن کر ان سے بہت کٹیلی نظمیں کہلواتی ہے۔ جس عمر میں انھیں محبتوں کو سینے سے لگانا تھا، انھیں اپنی دھرتی کے زخم دیکھتے بسر کرنا پڑی۔ ایسے میں ان کے سوالوں کا بانکپن تو دیکھیے:

میرے نام لکھے، پیغمبروں کے خطوں میں
کہیں نہیں لکھا
کہ اختلاف کا رنگ سرخ ہے
پھر کیوں ہر روز آلودہ کفن دفنائے جاتے ہیں؟

(عالمی ظالموں کے نام۔۱)

اپنے مصرعوں کی کاٹ میں وہ سارا شگفتہ کی یاد دلاتے ہیں، لیکن سارا کے برعکس انھیں نظم کو مکمل کرنے کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔

جب تم جمعہ پڑھ رہے ہوتے ہو
میں نفیس دن کی اُجلی روشنی میں

Scanned with CamScanner

کائنات کے عظیم پھول سے خوش بوکشید کر رہا ہوتا ہوں

آسمان پر ایک ہی درخت ہے
جسے تمھارے سجدے سیراب کرتے ہیں
اپنی جھولیاں جتنی بھی کشادہ کرلو
اُس کے پھل ہمیشہ کائنات سے باہر گر جاتے ہیں

آؤ تمھاری اُوسر روح میں بہار پھونکنے کے لیے
کچناروں کی تازہ کونپلیں چننے چلیں
(مسجد کے سائے میں تم سوکھ جاؤ گے)

(۳)

پولستانی ادیب چیسلا ومیلوش (Czeslaw Milosz) کو سن پچاس کی دہائی کے اوائل میں اسی آمریت کا سامنا تھا جس میں مکالمہ اور ڈسکورس صرف کچھ مخصوص حدود کے اندر ہی ہوسکتا تھا، جس میں رنگ ماسٹر نے منطق اور مکالمے کے اصول اور ضوابط پہلے ہی سے وضع کر رکھے تھے اور انسان سدھائے ہوئے بندروں کی طرح ان ضوابط سے انحراف سے پہلے پہلے اپنے آپ پر خود ہی سنسر نافذ کر دیتے تھے۔ چیسلا ومیلوش نے ان سفاک ایام میں 'اسیر ذہن' (The Captive Mind) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ کتاب میں پولستانی ناول نگار وتکیے وچ کے ایک ناول کا تذکرہ ہے جس میں وتکیے وچ نے 'مرتی بنگ' نامی گولیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ گولیاں کھا کر ہر انسان میں ایک نئے ایمان کی حرارت دوڑ جاتی ہے۔ اسے بس ہری ہری سوجھتی ہے اور وہ ایک خوش وخرم زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ میلوش ایسی گولیوں کو ایک زندہ معاشرے کے لیے زہر قرار دیتا ہے جنھیں کھا کر سب لوگ ایک ہی طرح سے سوچنے لگیں۔ کیا ہمارے بچوں کی مطالعہ پاکستان اور معاشرتی علوم کی کتابوں میں مرتی بنگ کی یہی گولیاں ملفوف نہیں؟ ایسی گولیاں کھا کر ہمارے شاعر، ادیب کیسا ادب تخلیق کر سکتے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ آج کے پولینڈ کے بجائے اس کتاب کی زیادہ ضرورت آج کے پاکستان کو ہے۔ مجھے فی الحال یہ بھی اصرار نہیں کہ ہماری ریاست کی سمت سے متعلق کوئی ایک نقطۂ نظر بہتر ہے یا دوسرا۔ فی الحال تو میری آرزو بس اتنی سی ہے کہ معاشرے میں فکری ڈسکورس کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوں تا کہ ہمارے شاعر اور ادیب زیادہ فراخی سے اظہار کر سکیں۔

ہمارے ادبی ڈسکورس میں مذہب کے علاوہ اگر کسی فکری سلسلے کی بات ہوئی تو وہ مارکسیت کا فکری

سلسلہ تھا۔ مارکسیت نے ریاست کے ذریعے انصاف و مساوات رائج کرنے کا خواب دیکھا۔ انسانی ارتقاء کے مراحل کے دوران ریاست جیسے ادارے کا قیام ایک بہت اہم مرحلہ تھا۔ جن دنوں جدید ریاست کے خال و خد وضع کرنے کی بات ہو رہی تھی ان دنوں جیک ہابز کا یہ قول بہت مشہور ہوا تھا کہ 'انسان بنیادی طور پر غاصب ہے'، اس کے بعد انسانی فکر اس بات کی کوشش میں لگی رہی کہ کم زور انسانوں کو طاقت ور انسانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ریاست کو سہارا بنایا جائے۔ مگر یہ ریاست ایک روز نازی جرمنی کے ڈراؤنے خواب کی صورت نمودار ہوئی۔ ادھر مارکسی ریاست کا اینمل فارم اسٹالن کے سوویت یونین کی صورت سامنے آیا۔ آج جیک ہابز کے مقابلے میں ایک اور قول کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ قول کارل پوپر کا ہے جو کہتا ہے کہ 'ریاست ایک لازمی برائی ہے۔' معاصر مفکر چومسکی تو اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی کہتا ہے کہ 'دنیا کی ہر ریاست بدمعاش ریاست ہوتی ہے۔' آج دنیا بھر کی جمہوری ریاستوں میں یہی غور و فکر جاری ہے کہ ریاست کی خرابیوں کو کیسے کم سے کم کیا جائے۔ ریاست کی جگہ ریاستی اور غیر ریاستی اداروں کو مضبوط بنانے کی بات ہو رہی ہے، اور یہ ادارے ایک دوسرے پر نظر رکھ کر ریاست کے شہریوں کے لیے ایک متوازن ماحول پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ بہ قول کارل پوپر 'جمہوریت دراصل خود کچھ نہیں کر سکتی، صرف جمہوریت میں رہنے والے شہری کچھ کر سکتے ہیں۔' ادب بھی ایک ادارہ ہے، مگر یہ اپنے سماج کے لیے کوئی نسخہ تجویز نہیں کرتا بلکہ اپنے سماج کی بھرپور نمائندگی کر کے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے اور ریاست کے دوسرے ادارے اپنے ادب کے آئینے میں خود اپنا چہرا دیکھ سکتے ہیں اور چاہیں تو اس کی نوک پلک درست کر سکتے ہیں۔

ایک متوازی ڈسکورس کی ضرورت ہمیں صرف نظریہ اور فکر کے میدان ہی میں نہیں بلکہ ادب کے میدان میں بھی ہے۔ ہمیں ادب میں بھی مسلسل سوال اٹھانے چاہئیں۔ ادب کے شعبے میں جن امور کو طے شدہ سمجھا جاتا ہے ان کی طے شدگی بھی ایک آمریت، ایک جبر ہے۔ ادب کے ہر قاری کو اپنے فیصلے نئے سرے سے کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ ایک زندہ معاشرہ وہی ہوتا ہے جو قلیل تعداد رکھنے والی لسانی و ثقافتی اکائیوں کے سر پر بھی ہاتھ رکھتا ہے اور نئے نویلے خیالات کو بھی فراخ دلی سے اپنے پر پھیلانے کا موقع دیتا ہے۔ اگر لسانی و ثقافتی اقلیتوں کو بھی اسی خدا نے پیدا کیا ہے جس پر اہل جبہ و دستار یقین رکھتے ہیں تو پھر ان مردانِ خدا کو بھی موقع دیجیے کہ یہ اپنے نقوش فکر و فن کو ثباتِ دوام دینے کی کوشش کر دیکھیں۔ مگر آج ہمارے ملک میں کبھی ایک تو کبھی دوسری قسم کے مردانِ خدا کے لیے نقش آرائی تو کیا، سانس تک لینے کی اجازت ممنوع قرار دی جا رہی ہے۔ دوسری جانب بیمار اُباسی جیسے صحافتی مفتی ہیں جو فقط 'گالیوں' پر اتنی دہائیاں دیتے ہیں کہ کہنا پڑتا ہے: 'گالی سے ڈر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔

ایسی بات نہیں ہے کہ ہمارے ہاں مقتدر اور غالب ڈسکورس کے متوازی کوئی ڈسکورس موجود ہی نہیں۔ متوازی ڈسکورس موجود ضرور ہے لیکن اس کی ایک بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑ سکتی ہے۔ یہ قیمت

سماجی نفرت سے لے کر پر تشدد موت تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ چند سال پہلے ڈاکٹر مبارک حیدر کی کتاب 'تہذیبی نرگسیت' سامنے آئی جس نے مقتدر ڈسکورس کے متوازی سوالات کا ایک لشکر کھڑا کر دیا۔ علی عباس جلال پوری اور سید سبط حسن کے بعد اب مبارک حیدر کا دم غنیمت ہے۔ کیا یہ خیال کم خوش کن ہے کہ دنیا کے ہر یقین کی کونپل کسی نہ کسی انکار ہی سے پھوٹی تھی!

اس مضمون میں بہت سے شاعروں اور بہت سی نظموں کا تذکرہ رہ گیا ہوگا۔ ان میں سے زیادہ تر نظمیں وہ ہوں گی جو میرے مطالعے سے نہیں گزریں۔ لیکن مجھے تو ادب کی دیگ سے کچھ چاول ہی دکھانے تھے۔ بس آخر میں ایک قصہ ضرور سنانا چاہوں گا۔ یہ شاید نائن الیون سے پہلے کی بات ہے کہ ایک نوجوان نے گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں نظم پڑھی تھی جس میں علامہ اقبال کی فکر اور ان کے شعری کلیشے کے حوالے سے سوال اٹھائے گئے تھے۔ ان کی مشہور نظم ''مسجدِ قرطبہ'' ہی کی بحر میں اس کی ادھ کچری لائنیں کچھ یوں تھیں کہ: روتا ہی تو رہ گیا، قرطبہ وصقلیہ۔ اور یہاں چھن گئے لکھنؤ اور آگرہ۔ وہاں علامہ اقبال کے مدّاح ایک بزرگ نے اس کے ساتھ ساتھ نئی نسل کو بھی گم راہی کی جانب گام زن بتایا تھا۔ وہ نوجوان یہ نہیں بتا سکا تھا کہ اپنے ہم عمروں میں سب سے زیادہ اسی کو اقبال سے دلچسپی ہے اور اقبال اس کے لیے ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اگر اقبال کو قرطبہ وصقلیہ کے چھن جانے کا غم ہو سکتا ہے تو اُسے لکھنو اور آگرہ کے گنوا دینے کا درد کیوں نہ ہو؟ وہ تو آج بھی مانتا ہے کہ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی۔ لیکن یہ قومِ رسولِ ہاشمی دوسروں کے ساتھ مل جل کر گزارا کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ تو صرف وہ سوال اٹھانا چاہتا تھا جن کے جواب اسے نہیں مل پا رہے تھے۔ اگر پڑوس کی دکان سے ملنے والی گیٹ تھرو گائیڈ سے اس کی دھرتی کے مسائل حل ہو سکتے تو سب سے زیادہ خوشی اسے ہی ہوتی۔ لیکن وہ تو مذہب اور فقہ کے بت ٹوٹنے سے بکھر جانے والی کرچیاں بھی چنتا رہا تھا جو کہیں زیادہ زخم دہ تھیں، سو وہ کسی چلی ہوئی فلم کا یہ ڈائیلاگ کیوں نہ دہراتا کہ ایک گناہ اور سہی۔ وہ یہ کیوں نہ سوچتا کہ نفرت کی بنیاد پر تو شاعری بھی کھڑی نہیں کی جا سکتی، ایک ریاست کیسے کھڑی کی جا سکتی ہے؟ خوف کی دو ہزار پتا نہیں کتنے کلومیٹر لمبی سڑک کے دائیں بائیں پاکستان کے شہری فقط اپنے قتل کو موخر کر دیے جانے پر کب تک شکر گزار رہ سکتے ہیں؟ تاریخ سے اجتماعی مباشرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ایک ریاست اگر ہر جگہ ہندو تلاش کرتی ہوئی اب آئینوں پر بھی چاند ماری کرنے لگی ہے تو حیرت کیسی؟